Ertuğrul Ghazi–ارطغرل غازی



بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام جیسا کہ ہم سب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ موجودہ دور میں میڈیا کا کردار اس قدر مضبوط، پُر اثر اور برق رفتار ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے ذرائع کا ہوگا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک عالم یا مفتی مسجد کے ممبر پر بیٹھ کر جب کوئی مسئلہ بیان کرتا ہے تو اس بیان سے مستفید ہونے والوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ سینکڑوں یا ہزاروں لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور بیان ایک مخصوص علاقے کے لوگوں تک ہی محدود رہتا ہے جبکہ اس کے برعکس اسی بیان کو یوٹیوب پر لائیو نشر کیا جائے تو سننے والوں کی تعداد پوری دنیا کے لاکھوں اور کروڑوں لوگوں تک جا پہنچتی ہے اور لوگوں کے پاس اس بیان کو دوسروں تک پہنچانے کی سہولت بھی میسر رہتی ہے۔ یہاں میں اس مسلئے کو زیر بحث لائے بغیر کہ میڈیا کا استعمال جائز یا ناجائز ہے، میں قارئین کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ کسی بھی چیز کے استعمال کا طریقہ کار اور اس سے حاصل ہونے والے مقاصد اگر درست ہیں اور شریعت کے اصولوں کے عین مطابق ہیں تو پھر اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں جب تک کہ اس کا استعمال نص قطعی سے ناجائز ثابت نہ ہو۔ لہٰذا میڈیا کے استعمال کے جائز یا ناجائز ہونے پر میرا رجحان ان علمائے کرام کی طرف ہے جنہوں نے دینی امور پر میڈیا کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔

اب میں اصل موضوع کی طرف آپ سب کی توجہ دلانا چاہتا ہوں جس کو سمجھانے کے لئے میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں۔ جیسا کہ ہم سب مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ ڈرامہ یا فلمیں دیکھنا حرام ہے کیونکہ ڈراموں اور فلموں میں ناچ گانا اور بے حیائی کے تقریباً تمام کام ہو رہے ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے ڈرامے جن میں ناچ گانا اور بے حیائی دکھائے بغیر ہمیں ہمارے شاندار ماضی اور نسہری تاریخ کے حقیقی کرداروں کے حالات دکھائے گئے ہوں، دیکھنا جائز ہے یا ناجائز؟

اس سوال کا جواب ہمارے موجودہ دور کے جید عالم دین اور اسکالرز میں سے محترم جناب ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب اور جناب مفتی طارق مسعود صاحب دامت برکاتہم یہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی ڈرامہ یا فلم موسیقی، ناچ گانوں اور بے حیائی سے پاک ہے اور جس میں مرد و عورت کی قربت اور بے پردگی کو دکھانے سے گریز کیا گیا ہو۔ ایسے ڈرامے یا فلمیں کسی بہتر مقصد کے تحت دیکھنا جائز ہے۔

اب ہم اپنے اگلے اور اہم تریں سوال کی طرف بڑھتے ہیں کہ کیا کسی مسلمان کے لئے موجودہ دور میں ترکی کی تاریخ پر بننے والا ڈرامہ ارطغرل غازی دیکھنا جائز ہے؟

اس سوال کے جواب میں محترم جناب ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب اور جناب مفتی طارق مسعود صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ "کیونکہ ارطغرل ڈرامے میں موسیقی، نامحرم مرد و عورت کی تھوڑی بہت قربت اور عورتوں کو چہرے کے حجاب کے بغیر دکھایا گیا ہے لہٰذا مسلمانوں کے لئے یہ ڈرامہ دیکھنا جائز نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اس ڈرامے میں عورتوں کو مکمل اسلامی لباس میں دکھایا گیا ہے جس میں کسی قسم کی عریانیت، بے حیائی اور ناچ گانا موجود نہیں ہے لہٰذا یہ ڈرامہ ان ڈراموں اور فلموں کی طرح حرام نہیں ہے جن میں ناچ گانا، برہنہ عورتیں اور بے حیائی کے تمام کام دکھائے جاتے ہیں"۔ آپ دونوں عالم دین نے ان لوگوں کو اس ڈرامے کو دیکھنے سے منع فرمایا جو لوگ کسی بھی طرح کے ڈراموں اور فلموں کے دیکھنے کے عادی نہیں، لیکن ایسے لوگوں کو اس ڈرامے کے دیکھنے کی گنجائش دی جو لوگ پہلے سے انڈین اور ہالی ووڈ کی فلمیں اور ڈرامے دیکھنے کے عادی ہیں۔ تاکہ ایسے لوگوں کو بڑے گناہ سے کم درجے کی برائی تک محدود رکھا جاسکے اور چونکہ موجودہ دور کا مسلمان کتابیں پڑھنے سے بہت دور اور ہمارے اسلامی تاریخ اور شاندار ماضی سے ناآشنا ہے، لہٰذا اِسے ان ڈراموں کے ذریعے سے ہمارے اسلامی اخلاقی اقدار اور دین اسلام کی خاطر دی گئی قربانیوں کا علم ہو سکے گا۔ اس طرح ہم آج کے مسلم نوجوانوں کو نہ صرف غیر مسلم میڈیا کی یلغار اور گمراہیت سے محفوظ کر سکیں گے بلکہ اس کے دل میں جہاد کا جذبہ اور اسلام سے محبت کو بھی جگانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ اور ساتھ ہی غیر مسلموں اور اسلام دشمن عناصر کا یہ پروپگینڈا کہ اسلام ایک دہشت گرد مذہب ہے اور صرف دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے، اس پروپگینڈے کے خلاف بھی ارطغرل غازی جیسے ڈراموں کے ذریعہ غیر مسلم دنیا کو اسلام کا حقیقی پہلو دکھایا جاسکتا ہے۔

اکیسویں صدی عیسوی کے اس ترقی یافتہ دور میں ہمیں اسلام دشمن عناصر کا مقابلہ موجودہ دور کے جدید تقاضوں کے عین مطابق ہی کرنا پڑے گا۔ جس طرح اسلام دشمنوں نے اپنے سازشی میڈیا کے ذریعہ اسلام کو بدنام کرنے کی کوششیں کیں بالکل اسی طرح سے ہمیں اپنے میڈیا کے ذریعہ اسلام کا شاندار، پُر وقار اور حقیقی منظر پیش کر کے غیر مسلم دنیا کو اسلام کی خوبصورتیوں سے آگاہ کرنا ہو گا۔

موجودہ دور میں ۹۹ فیصد لوگ موبائل اور انٹرنیٹ کا استعمال کرتے ہیں اس لئے اگر ہم یہ چاہیں کہ آج کے مسلمانوں کو ڈرامے اور فلموں سے بالکل روک لیں ایسا کرنا اب ناممکن ہے لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اس کا متبادل راستہ اختیار کریں۔ اس کے لئے میں موجودہ دور کے پاکستانی میڈیا (ڈرامہ و فلم انڈسٹری) کے لوگوں سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ بے کار و بے مقصد اور اخلاقیات سے گرے

ہوئے ڈرامے اور فلمیں بنانے کے بجائے ہماری اسلامی تاریخ میں گزرے حقیقی کرداروں مثلاً: محمد بن قاسم، سلطان صلاح الدین ایوبی، ارطغرل غازی، عثمان غازی، اورخان، سلطان محمد فاتح، ظہیر الدین بابر، قطب الدین ایبک اور ٹیپو سلطان جیسے اسلامی ہیروز پر ڈرامے اور فلمیں بنا کر دنیا کو اسلام کا حقیقی رُخ پیش کریں۔

رہا سوال اس بات کا کہ موسیقی، ناچ گانوں اور عریاں عورتوں کے بغیر ڈرامہ یا فلمیں لوگوں میں مقبول نہیں ہونگی، تو میرے بھائیوں اس اشکال کا بہترین جواب خود ارطغرل غازی ڈرامہ ہے جو بغیر ناچ گانے، برحنہ عورتوں اور بے حیائی کے بغیر بھی پوری دنیا خاص طور پر پاکستان میں اس قدر مقبول ہو چکا ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے اپنے چینل پر دکھاجانے کے باوجود بھی یوٹیوب پر صرف دیڑھ ماہ کے کم عرصے میں ارطغرل ڈرامے کے ۷ ملین سبسکرائیبرز ہو چکے ہیں۔

اب ہم اس موضوع کے آخری حصہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ ارطغرل غازی کو لے کر اس وقت پوری دنیا میں یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ ارطغرل غازی کون تھا۔ کیا ارطغرل غازی واقعی کوئی حقیقی کردار ہے یا پھر ایک فرضی کردار ہے۔ کیا واقعی دنیا کی سب سے عظیم شان سلطنت خلافت عثمانیہ کا حقیقی بانی ارطغرل غازی تھا جس نے عالم اسلام کو متحد کرنے کا خواب دیکھا تھا اور بعد میں اس کے بیٹے عثمان غازی نے اس کے خواب کو پورا کر دکھایا؟ کیا واقعی ایک خانہ بدوش قبیلہ کے سردار نے دنیا کی دو اہم ترین طاقتوں منگلولوں اور صلیبیوں سے جنگ کر کے ان دونوں کو شکست دی اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ بحال کی تھی۔ موجودہ دور میں یہ بحث اس لئے ہو رہی ہے کہ یہ ڈرامہ دیکھ کر مسلم دنیا خصوصاً پاکستان میں ایک تہلکہ مچ گیا ہے اور جو لوگ پہلے انڈین اور ہالی ووڈ کی فحش فلمیں دیکھنے کے عادی تھے آج ارطغرل ڈرامہ دیکھ کر اپنی شخصیت اور مزاج میں تبدیلی محسوس کر رہے ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ارطغرل ڈرامے کا سب سے بڑا مخالف وہ لبرل طبقہ ہے جس نے میڈیا اور عورتوں کی آزادی کے نام پر ڈراموں اور فلموں کی سب سے زیادہ حمایت کی ہے اور اسلامی شریعت اور اخلاقی اقدار کی سب سے زیادہ مخالفت کی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ایسے آزاد خیال لوگ آج ایک ڈرامے کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں؟ ذرا سوچیئے۔۔۔

اب ہم کچھ باتیں اس ڈرامے کی کہانی پر کرتے ہیں۔ ارطغرل ڈرامہ میں بہت سلیقے کے ساتھ منگلولوں کا ظلم و ستم، صلیبیوں کی سازش اور اپنوں کی غداری دیکھائی گئی ہے۔ ڈرامہ میں بتایا گیا ہے کہ جس طرح آج مسلم دنیا کے حالات ہیں بالکل اسی طرح تیرہویں صدی عیسوی میں بھی مسلمانوں کے حالات بدتر تھے۔ چنگیز خان اور ہلاکو خان کی فوجیں مسلمانوں کو تباہ و برباد کر رہی تھی۔ صلیبی مسلسل مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں لگے ہوئے تھے اور مسلمان بھی اندرونی اختلافات کی وجہ سے کم ہمتی کا شکار تھے۔ وہ صلیبیوں اور منگلولوں کی سازشوں کا شکار ہو کر اپنوں کے ساتھ ہی غداری کرتے تھے۔ ان مشکل حالات میں ارطغرل غازی نے عالم اسلام کو متحد کرنے اور انہیں ذلت و رسوائی سے نکالنے کا خواب دیکھا اور اس کو سچ ثابت کرنے کیلئے انہوں نے جدو جہد شروع کر دی۔ صلیبیوں اور منگلولوں میں اپنا خوف قائم کر دیا۔ ان کی وفات کے دس سال بعد ان کے بیٹے عثمان غازی نے ۱۲۹۹ میں سلطنت عثمانیہ کی بنیاد رکھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ سلطنت تین براعظموں پر پھیل گئی اور دنیا کی سب سے لمبی مدت

تک قائم رہنے والی اور سب سے بڑی اور مضبوط سلطنت بن گئی جو ۳مارچ ۱۹۲۴ تک قائم رہی۔ڈرامہ میں بہت خوبصورتی کے ساتھ اسلامی تہذیب و ثقافت کو پیش کیا گیا ہے جس کو دیکھنے کے بعد دنیا کا ہر مسلمان ارطغرل کو اپنا ہیرو، محسن اور عظیم مجاہد سمجھنے لگا ہے۔ علاقائیت اور نسل و نسب کی بنیاد پر ذرہ برابر بھی تعصب کا خیال نہیں آتا ہے عرب و عجم، قبیلہ اور علاقائیت کے بنیاد پر پایا جانے والا آپسی تعصب کو یہ ڈرامہ مٹا رہا ہے۔

موجودہ دور میں اس ڈرامے کو لے کر یہ بحث بھی ہو رہی ہے کہ ڈرامہ میں جو کچھ دکھایا گیا ہے، کیا وہ تاریخ میں موجود ہے؟ حال ہی میں بی بی سی نے ایک مضمون لکھ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ارطغرل ڈرامہ میں جو کچھ دکھایا گیا ہے وہ حقیقت کے خلاف اور تاریخ کے برعکس ہے۔ کئی یورپین اور امریکی دانشوروں نے بھی اس ڈرمہ پر سوال اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ ارطغرل ایک گمنام شخصیت ہے جسے ترکی کے صدر رجب طیب اردگان نے زبردستی ہیرو بنا کر پیش کر دیا ہے۔

ہم اس تحریر کے آخر میں ارطغرل غازی کی شخصیت اور کردار کی حقیقت تاریخ کے اوراق میں سے مورخ اسلام جناب اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (المتوفی:۱۹۳۸ء) کی لکھی ہوئی کتاب "تاریخ اسلام" سے اور انگریز تاریخ دانوں کی کتابوں کے حوالوں سے پیش کریں گے جنہیں ۱۹۳۹ء میں جناب ڈاکٹر محمد عزیر، سابق رفیق دارالمصنفین، اعظم گڑھ نے اپنی کتاب "دولتِ عثمانیہ" میں رقم کیا۔

عثمانی دستاویزات میں ارطغرل کا نسب کچھ یوں ملتا ہے: "ارطغرل بن سلیمان شاہ بن کندز الپ بن قایا الپ بن کوک الپ بن صارقوق الپ بن قاي الپ"۔ قائی قبیلہ انہی سے منسوب ہے۔

مورخ اسلام جناب اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (المتوفی:۱۹۳۸ء) لکھتے ہیں: " ۶۲۱ھ میں جب مغلوں نے علاء الدین کیقباد کی ریاست پر حملہ کیا تو سلیمان خاں اور اس کے بیٹے ارطغرل نے اپنے ہم قوم ترکوں کو لے کر مغلوں کے خلاف علاء الدین کیقباد کی مدد کی، یہ مدد عین وقت پر پہنچی اور اس سے مغلوں کو شکست کھا کر فرار ہونا پڑا لہٰذا علاء الدین کیقباد سلجوقی نے سلیمان کو خلعت دے کر اپنی فوج کا سپہ سالار بنایا اور اس کے بیٹے ارطغرل کو شہر انگورہ کے قریب ایک وسیع جاگیر عطا کی۔

علاء الدین سلجوقی کا دارالسلطنت اس زمانہ میں شہر قونیہ تھا، ارطغرل کی جاگیر اور ریاست قیصر روم کے علاقے کی سرحد پر واقع تھی۔ ارطغرل نے اپنے باپ کے فوت ہونے پر اپنی ریاست کو وسیع کیا، کچھ علاقہ سلطان قونیہ سے انعام و اکرام کے طور پر حاصل کیا اور کچھ عیسائی علاقے کو دبایا، اس طرح ارطغرل کی ایک قابل تذکرہ ریاست قائم ہو گئی' مغلوں نے ایشیائے کوچک کے ان چھوٹے رئوساء سے کچھ زیادہ تعرض نہیں کیا اور ان کو ان کے حال پر قائم رہنے دیا۔ ۶۴۱ھ میں علاء الدین کیقباد سلجوقی کے بیٹے غیاث الدین کیخسرو کو مغلوں کا خراج گذار ہونا پڑا۔ ۶۵۷ھ میں ارطغرل کا بیٹا عثمان خان پیدا ہوا۔ ۶۸۷ھ میں ارطغرل فوت ہوا اور اس کا بیٹا عثمان خان بعمر تیس سال باپ کی جگہ ریاست کا مالک و فرماں روا ہوا۔ شاہ قونیہ یعنی غیاث الدین کیخسرو سلجوقی نے اپنی بیٹی کی شادی عثمان خان سے کر دی اور اس کو اپنی فوج کی سپہ سالاری کا عہدہ بھی عطا کیا۔ ۶۹۹ھ میں غیاث الدین کیخسرو سلجوقی جب مقتول ہوا تو تمام سلجوقی ترکوں نے سلطنت قونیہ کے تخت پر عثمان خان کو بھٹایا اور اس طرح اپنی قدیمی ریاست کے علاوہ قونیہ کا

علاقہ بھی عثمان خان کے زیر تصرف آ گیا۔ عثمان خان نے اپنے آپ کو سلطان کے لقب سے منسوب کیا۔ یہی پہلا سلطان ہے جس کے نام سے اس کے خاندان میں سلطنت عثمانیہ قائم ہوئی"۔ (تاریخ اسلام: جلد ۲، صفحہ نمبر ۳۹۲-۳۹۱)

391 تاریخ اسلام جلد۲

کر لیا اور اسلام کے خادم بن گئے۔ دو سو برس کے بعد براعظم ایشیا میں مغلوں کی حکومتیں کمزور ہوتے ہوتے نابود ہونے لگیں اور ان کی جگہ کثیر التعداد چھوٹی چھوٹی ریاستیں جابجا ایران و خراسان و عراق و ماوراء النہر میں قائم ہو گئیں۔

سنہ ۸۰۰ھ کے قریب ان مغلوں کے تنزل و بربادی کے عالم میں ایک شخص تیمور سردار ہوا۔ اس نے اپنی ملک گیریوں اور فتح مندیوں سے تمام براعظم ایشیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا اور دنیا کو ایک مرتبہ پھر چنگیز خاں کی ملک گیریوں کا تماشہ دکھا دیا۔ تیمور چونکہ مسلمان تھا، اس لیے اگرچہ قتل و غارت گری کے ہنگامے اس کے ذریعہ سے بھی بہت رونما ہوئے۔ تاہم اس کی ملک گیریاں زیادہ عرصہ تک نہ رہیں۔ انہوں نے بھی تقریباً اتنا عرصہ حکومت کی جتنا عرصہ چنگیز خاں کی اولاد نے حکومت کی تھی۔ جس طرح چنگیز خاں کی اولاد کا تنزل ہوا، بالکل اسی طریقہ اور اسی رفتار سے تیمور کی اولاد کا زوال ہوا۔ جتنے دنوں چنگیزی مغلوں نے ایشیاء کے ملکوں پر حکومت کی تھی، قریباً اتنے ہی دنوں تیموری مغلوں کا دور دورہ رہا۔ جب ایران و ترکستان وغیرہ سے تیموری خاندان کی حکومت مٹ گئی تو تیمور کی اولاد میں ایک شخص بابر پیدا ہوا۔ اس نے ہندوستان و افغانستان میں ایک زبردست حکومت کی بنیاد ڈالی جو عرصہ تک اس کے خاندان میں باقی رہی۔

دولت عثمانیہ (ترکی):

ترکان غز کا تذکرہ اوپر کہیں آ چکا ہے۔ ان ترکان غز کے اکثر قبائل کو سلجوقیوں نے دھکیل کر صوبہ ارمینیا اور بحیرہ قزوین کے ساحلوں کی طرف پہنچا دیا تھا۔ انہیں میں ایک وہ قبیلہ تھا جس کو سلطنت عثمانیہ کو قائم کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ جب سلاطین سلجوقیہ کا دور دورہ ختم ہوا اور تاتاریوں نے ایشیا کے ملکوں میں ہنگامے برپا کرنے شروع کر دیے تو اس زمانے میں ایشیائے کوچک کے اس حصے میں جو مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، دس بارہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں۔ ان ریاستوں میں اکثر سلجوقی شہزادے یا سلجوقیوں کے موالی حکومت کرتے تھے۔ انہیں میں ایک ریاست سرحد ارمینیا پر ترکان غز کے مذکورہ قبیلہ کے سردار سلیمان خاں کے قبضے میں تھی۔ سنہ ۶۲۱ھ میں جب مغلوں نے علاؤالدین کیقباد سلجوقی کی ریاست پر حملہ کیا تو سلیمان خاں اور اس کے بیٹے ارطغرل نے اپنے ہم قوم ترکوں کو لے کر مغلوں کے خلاف علاؤالدین کیقباد کی مدد کی۔ یہ مددعین وقت پر پہنچی اور اس سے مغلوں کو شکست کھا کر فرار ہونا پڑا۔ لہٰذا علاؤالدین کیقباد سلجوقی نے سلیمان کو خلعت دے کر اپنی

فوج کا سپہ سالار بنایا اور اس کے بیٹے ارطغرل کو شہر انگورہ کے قریب ایک وسیع جاگیر عطا کی۔ علاؤ الدین سلجوقی کا دارالسلطنت اس زمانے میں شہر قونیہ تھا۔ ارطغرل کی جاگیر اور ریاست قیصر روم کے علاقے کی سرحد پر واقع تھی۔

ارطغرل نے اپنے باپ کے فوت ہونے پر اپنی ریاست کو وسیع کیا۔ کچھ علاقہ سلطان قونیہ سے انعام و اکرام کے طور پر حاصل کیا اور کچھ عیسائی علاقے کو دبایا۔ اس طرح ارطغرل کی ایک قابل تذکرہ ریاست قائم ہوگئی۔ مغلوں نے ایشیائے کوچک کے ان چھوٹے رؤسا سے کچھ زیادہ تعرض نہیں کیا اور ان کو ان کے حال پر قائم رہنے دیا۔

سنہ ۶۴۱ھ میں علاؤ الدین کیقباد سلجوقی کے بیٹے غیاث الدین کیخسرو کو مغلوں کا خراج گزار ہونا پڑا۔ سنہ ۶۵۷ھ میں ارطغرل کا بیٹا عثمان خاں پیدا ہوا۔ سنہ ۶۸۷ھ میں ارطغرل فوت ہوا اور اس کا بیٹا عثمان خاں بہ عمر تیس سال باپ کی جگہ ریاست کا مالک و فرماں روا ہوا۔ شاہ قونیہ یعنی غیاث الدین کیخسرو سلجوقی نے اپنی بیٹی کی شادی عثمان خاں سے کردی اور اس کو اپنی فوج کی سپہ سالاری کا عہدہ بھی عطا کیا۔ سنہ ۶۹۹ھ میں غیاث الدین کیخسرو سلجوقی جب مقتول ہوا تو تمام سلجوقی ترکوں نے سلطنت قونیہ کے تخت پر عثمان خاں کو بٹھایا اور اس طرح اپنی قدیمی ریاست کے علاوہ قونیہ کا علاقہ بھی عثمان خاں کے زیر تصرف آ گیا۔ عثمان خاں نے اپنے آپ کو سلطان کے لقب سے منسوب کیا۔ یہی پہلا سلطان ہے جس کے نام سے اس کے خاندان میں سلطنت عثمانیہ قائم ہوئی۔ عثمانی سلاطین نے بہت جلد تمام ایشیائے کوچک پر قبضہ کر کے قیصر روم کی حکومت کو ایشیا سے نابود کر دیا۔ سنہ ۷۶۳ھ میں سلاطین عثمانیہ نے ایڈریانوپل کو فتح کر کے اپنا دارالسلطنت بنایا اور صوبہ طرابلس پر قبضہ کر کے براعظم یورپ کے جنوبی و مشرقی حصہ میں اسلامی حکومت قائم کی۔ قیصر روم نے دب کر صلح کی اور عثمانیہ طاقت سے اپنے بقیہ ملک کو بچایا۔ اس کے بعد عثمانیوں نے عیسائیوں کو شکستیں دے کر یورپ میں اپنے مقبوضات کو وسیع کرنا شروع کیا۔ آخر سنہ ۷۹۲ھ میں آسٹریا، بلگیریا (بلغاریہ)، بوسنیا، ہنگری وغیرہ کے عیسائی سلاطین نے متحد و متفق ہو کر ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ سلطنت عثمانیہ پر حملہ کیا۔ سلطان مراد خاں عثمانی نے اپنی قلیل التعداد فوج سے مقام کسووا[1] پر عیسائیوں کے اس لشکر

---

[1] عصر حاضر میں (1990-91ء میں) عیسائیوں نے یورپ کی واحد مسلم ریاست بوسنیا اور اس کے دارالحکومت کسووا میں جس طرح لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور اس مسلم ریاست کو تباہ کیا، شاید یہ انہوں نے ۷۹۲ھ کی اپنی شکست فاش کا بدلہ لیا ہو۔

جناب ڈاکٹر محمد عزیر نے اپنی کتاب ''دولتِ عثمانیہ'' میں ارطغرل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ درج ذیل اسکین صفحات میں پیش خدمت ہے۔

ارطغرل

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کی ابتدا میں شاہانِ خوارزم کی قوت اوجِ شباب پر تھی، وہ ایران وخراسان اور شام وعراق میں آلِ سلجوق کے بیش تر مقبوضات پر قابض ہو چکے تھے اور ایشیا کی تمام اسلامی سلطنتوں کو فتح کر لینا چاہتے تھے لیکن عین اس وقت جب وہ اس حوصلہ کی تکمیل کے لیے تیار ہو رہے تھے، چنگیز خانی طوفان اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ اٹھا اور سلطنت خوارزم کو پاش پاش کر ڈالا، اس سلطنت کی تباہی کے بعد ترکی قبائل جنوب کی طرف بھاگے، ان میں بعض ایران اور شام میں پہنچے اور وہاں ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں بہت کچھ اقتدار حاصل کیا اور ترکمانی مشہور ہوئے اور بعض جنوب کی طرف بڑھے اور مصر کے سلاطین مملوک سے معرکہ آرا ہوئے، جو خود ترکی النسل تھے لیکن مصر میں انہیں شکست ہوئی اور وہاں سے واپس ہو کر وہ ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں سے آملے، ان ہی ترکی قبائل میں جو چنگیز خاں کے حملہ کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر مارے مارے پھر رہے تھے، ارطغرل کا قبیلہ بھی تھا، یہ قبیلہ ترکانِ اوغوز کے قبیلہ کا ایک جزو تھا جو ارطغرل کے باپ سلیمان شاہ کی سرکردگی میں اپنے وطن خراسان کو چھوڑ کر مختلف ملکوں میں گھومتا ہوا شام کی طرف جا رہا تھا کہ اثنائے راہ میں دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے سلیمان شاہ ڈوب کر ہلاک ہو گیا، قبیلہ کا بیش تر حصہ اس وقت منتشر ہو گیا لیکن جو لوگ رہ گئے وہ ارطغرل اور اس کے بھائی دوندار کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوئے اور

سلطان علاء الدین سلجوقی کی سلطنت میں داخل ہو گئے۔

پہلا معرکہ یہ جماعت جو صرف چار سو چوبیس[1] گھرانوں پر مشتمل تھی، سلطان علاء الدین کے زیر سایہ پناہ لینے کے لیے پایہ تخت قونیہ کی طرف جا رہی تھی کہ راستہ میں انگورا کے قریب ارطغرل کو دو فوجیں مصروف جنگ نظر آئیں، وہ کسی فریق سے واقف نہ تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ ان میں سے ایک تعداد کے لحاظ سے کم زور اور دوسری قوی ہے، اپنے سواروں کے مختصر دستہ کے ساتھ جن کی مجموعی تعداد صرف چار سو چوالیس تھی، کم زور فریق کی حمایت کے لیے بڑھا اور اس جاں بازی سے حملہ آور ہوا کہ دشمن کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا، فتح حاصل کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ جس فریق کی اس نے یوں بروقت مدد کی تھی، وہ سلطان علاء الدین سلجوقی کی فوج تھی، جسے تاتاریوں کی ایک بڑی فوج نے گھیر رکھا تھا۔

سنگ بنیاد ارطغرل کے اس کارنامہ کے صلہ میں سلطان علاء الدین نے اسے سغوت کا زرخیز علاقہ جو دریائے سقاریہ کے بائیں جانب بازنطینی سرحد کے قریب واقع تھا، جاگیر میں عطا کیا اور سغوت کا شہر بھی اسے دیا، اس علاقہ میں ارطغرل اور اس کے ساتھیوں نے، جو خراسان اور آرمینیا سے آئے تھے، بود و باش اختیار کی، علاء الدین نے ارطغرل کو اس جاگیر کا سپہ دار بھی مقرر کیا، چوں کہ ارطغرل کی جاگیر بازنطینی سرحد سے متصل واقع تھی، اس لیے بازنطینی قلعہ داروں سے اکثر جنگ کی نوبت آتی رہتی تھی، ارطغرل نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی شجاعت کا سکہ بٹھا دیا اور اس کی فتوحات کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے ترکی قبائل ایشیائے کوچک میں پہلے سے آباد تھے، اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے اور اس کی لڑائیوں میں شریک ہونے لگے، اس طرح اس کی قوت روز بروز بڑھتی گئی اور اس کا اقتدار گرد و پیش کے علاقوں میں قائم ہونے لگا۔

سلطان علاء الدین کے لیے ایک جاگیر دار کا اس طرح قوت و اقتدار حاصل کر لینا

---

[1] ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے، ص ۱۳ (The Turki Empire By Lord Eversley)

تشویش کا باعث ہوتا لیکن ایشیائے کوچک میں دولت سلجوقیہ اندرونی اختلال اور امراء کی بغاوتوں کے سبب زوال کی آخری منزل میں تھی، اگرچہ قونیہ میں سلاجقۂ روم کی قدیم شان و شوکت اب بھی نمایاں تھی تاہم حکومت کا دائرہ بہت محدود رہ گیا تھا، ایک طرف تاتاریوں نے جنوبی اور مشرقی علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا تو دوسری طرف عیسائیوں نے شمال اور مشرق کے قدیم بازنطینی صوبوں کے اکثر حصے واپس لے لیے تھے، اوسطی اور جنوبی حصہ میں متعدد سلجوقی سرداروں نے خودمختار حکومتیں قائم کر لی تھیں، سرحدی علاقوں میں جنگ کا سلسلہ عموماً جاری رہتا تھا اور تاتاری حملوں کا خطرہ کبھی دور نہیں ہوتا تھا، ایسی حالت میں ارطغرل جیسے دلیر سردار اور نائب کی فتوحات سے علاء الدین کو بجائے تشویش کے ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور اس نے ارطغرل کو مزید انعامات عطا کیے، چنانچہ جب نئی شہر اور بروصہ کے درمیان ایک جنگ میں ارطغرل نے علاء الدین کے نائب کی حیثیت سے تاتاریوں اور بازنطینیوں کی ایک متحدہ فوج کو شکست دی تو سلطان نے اس کے صلہ میں اس کے شہر کو بھی اس کی جاگیر میں دے دیا اور پوری جاگیر کا نام سلطانونی (صدر سلطانی) رکھا، نیز ارطغرل کو اپنے مقدمۃ الجیش کا سپہ سالار مقرر کیا، اس وسیع علاقہ میں بکثرت چراگاہوں اور زرخیز زمینوں کے علاوہ متعدد قلعے بھی تھے، مثلاً قراجہ حصار، بلے جیک، اینی وغیرہ لیکن سلطانونی کے اکثر حصوں پر خودسر امیروں کا قبضہ تھا اور اس جاگیر پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے ارطغرل اور اس کے بعد عثمان کو مدتوں جنگ کرنی پڑی، ہلال سلطان علاء الدین کے علم کا نشان تھا، ارطغرل نے بھی اس کے نائب کی حیثیت سے اسی نشان کو اختیار کیا جو آج تک ترکوں کی عظمت کا قومی نشان ہے[1]۔

۶۸۷ھ (۱۲۸۸ء) میں ارطغرل نے نوّے سال کی عمر میں انتقال کیا اور سغوت کے قریب دفن ہوا۔

---

[1] تاریخ ترکانِ عثمانی، از کریسی، جلد اول، ص ۷۵ (History of The Othomani Turks By Edward Creasy)

یہ بالکل صحیح بات ہے کہ ارطغرل کے حوالے سے تاریخ میں زیادہ تذکرہ نہیں ملتا لیکن تاریخی کتب میں ارطغرل کے حوالے سے جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ ہو بہو ویسا ہی ہے جیسا ڈرامے میں دکھایا گیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ارطغرل ایک گم نام شخصیت ہیں، جھوٹ اور دھوکہ دہی پر مبنی ہے۔ اس سے ڈرامہ کے اکثر کردار میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ تاریخ پڑھنے اور ڈرامہ دیکھنے کے بعد آپ یقینی طور پر یہی کہیں گے کہ ڈرامہ میں جو کچھ دکھایا گیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس وقت کے یہی حالات تھے جیسا ڈرامہ میں بتایا گیا ہے۔

اب اگر کوئی عقلمند انسان ہم سے یہ سوال کرے کہ ارطغرل کی تاریخ تو صرف پانچ سے دس صفحات پر لکھی ہوئی ہے تو پھر آپ نے اس کو بڑھا چڑھا کر پانچ سو اقساط پر مشتمل ڈرامہ سیریل کیسے بنالیا؟ اس اشکال کے جواب میں ہم یہی کہیں گے کہ تاریخ میں جب کسی شخصیت کے بارے میں لکھا جاتا ہے تو اس کی پیدائش سے لیکر وفات تک صرف اسی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے اور وہ بھی سب کچھ نہیں بلکہ چند مخصوص و مشہور باتیں جبکہ ڈرامے یا فلم میں اس کردار کے بقیہ معاملات کو بہت تفصیل سے دکھایا جاتا ہے اور ساتھ میں اس کردار سے جڑے دوسرے لوگوں کے حالات وواقعات کی بھی منظر کشی کرنی پڑتی ہے اور ساتھ میں بہت سے ایسے فرضی کردار بھی شامل کرنے پڑتے ہیں جن کا تاریخ میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ کیونکہ ہزار سالہ تاریخ میں ہر انسان اور ہر کردار کا ذکر ہونا ممکن نہیں، لہٰذا یہ اعتراض ہی بالکل بے بنیاد ہے۔

کیا ارطغرل بت پرست تھا؟

آج کل ارطغرل ڈرامے کو لیکر یہ بحث بھی چھڑی ہوئی ہے کہ کیا حقیقت میں ارطغرل ایسا ہی تھا جیسا ڈرامے میں دکھایا گیا ہے یا ان سب باتوں کے بالکل برعکس وہ ایک بت پرست تھا؟

اس اشکال کی اصل وجہ ڈاکٹر محمد عزیر صاحب کی لکھی ہوئی کتاب ”دولت عثمانیہ“ میں درج برطانوی مصنف مسٹر ہربرٹ گینس کی ایک تازہ ترین تحقیق ہے جس کے بارے میں لکھتے ہوئے ڈاکٹر محمد عزیر صاحب فرماتے ہیں کہ: ”اب سے بائیس سال قبل تک یہ امر عموماً مورخین کے نزدیک مسلم تھا کہ ارطغرل اور اس کے ساتھی ایشیائے کوچک میں داخل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے۔ لیکن ۱۹۱۶ء میں مسٹر ہربرٹ گینس نے اپنی مستند تالیف "اساس سلطنت عثمانیہ" کو شائع کرکے یہ تازہ تحقیق پیش کی کہ سغوت میں بودوباش اختیار کرتے وقت عثمان اور اس کے قبیلے کے لوگ بت پرست تھے۔ مسٹر گینس کے دلائل حسب ذیل ہیں“:

وصیت کے مطابق اسے بروصہ میں دفن کیا گیا اور اس کی قبر پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

سلطنت | عثمان دولت عثمانیہ کا پہلا تاج دار ہے، اس بنا پر عموماً اس کے نام کے ساتھ سلطان کا لقب بھی شامل کر دیتے ہیں لیکن خود اس نے اور اس کے بعد اورخان اور مراد اول نے صرف ''امیر'' ہی کا لقب اختیار کیا[1]، ارطغرل کی وفات پر اس کے مقبوضات کا دائرہ سغوت، اس کی شہر اور چند مواضعات پر ختم ہو جاتا تھا، عثمان نے اپنی اڑتیس سال کی حکومت میں اس دائرہ کو جنوب میں کوتاہیہ اور شمال میں بحر مارمورا اور بحر اسود کے ساحلوں تک وسیع کر دیا، اس کی قلم رو کا طول تقریباً ۱۲۰ میل اور عرض تقریباً ۶۰ میل تھا[2]، آبادی صرف ترکوں پر مشتمل نہ تھی، بلکہ بیش تر علاقے چوں کہ سلطنت بازنطینی کے ایشیائی مقبوضات سے حاصل کردہ تھے، اس لیے آبادی میں ایک بڑی تعداد یونانی اور سلافی باشندوں کی بھی تھی، جو بخوشی مسلمان ہو کر ترکوں میں شامل ہو گئے تھے، ایورسلے لکھتا ہے کہ یہ عیسائی کسی جبر سے اسلام نہیں لائے کیوں کہ تاریخ میں نہ تو قیدیوں کے قتل عام کا کوئی ذکر ہے اور نہ بحیثیت غلام انہیں فروخت کرنے کا بلکہ ان کے اسلام لانے کی وجہ یہ ہوئی کہ قسطنطنیہ کے یونانیوں نے جو فطری طور پر ان کے محافظ تھے، انہیں چھوڑ دیا تھا[3]، اسلام میں داخل ہونے کے بعد فاتح اور مفتوح کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم ہو گئے اور دونوں کے میل سے ایک نئی نسل تیار ہونے لگی، جو دوسری ترکی ریاستوں کے باشندوں سے بہت کچھ مختلف تھی اور اپنے کو ''عثمانی'' کہتی تھی۔

عثمان کا اسلام | اس موقع پر خود عثمان اور اس کے قبیلے کے اسلام لانے کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے، اب سے بیس بائیس سال قبل تک یہ امر عموماً مؤرخین کے نزدیک مسلم تھا کہ ارطغرل اور اس کے ساتھی ایشیائے کوچک میں داخل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے لیکن

---

[1] کریسی، جلد ا، ص ۱۷ [2] ترکی سلطنت، از لارڈ ایورسلے، ص ۱۵، مطبوعہ لندن ۱۹۲۴ء (The Turkish Empire By Lord Eversley [3] ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے، ص ۱۶، مطبوعہ لندن ۱۹۲۴ء۔

۱۹۱۶ء میں مسٹر ہربرٹ گبنس نے اپنی مستند تالیف ''اساس سلطنت عثمانیہ''[1] کو شائع کر کے یہ تازہ تحقیق پیش کی کہ سغوت میں بود و باش اختیار کرنے کے وقت عثمان اور اس کے قبیلہ کے لوگ بت پرست تھے، مسٹر گبنس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدا میں خراسان اور ماوراالنہر کے دوسرے علاقوں کی جو قومیں ایشیائے کوچک کی سرحدوں پر نمودار ہوئیں اُن کے اسلام لانے کا کوئی صریح ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا، ان سے پہلے کے ترک حملہ آور جب اس ملک میں داخل ہوئے تو وہ کئی پشتوں سے عربی اسلام کے زیر اثر رہتے آئے تھے، چنانچہ آل سلجوق بھی مسلمان ہی تھے لیکن بعد کے آنے والے ترک جن میں عثمان پیدا ہوا، کچھ بہت زیادہ اسلام کے زیر اثر نہیں رہے، خود عثمانیوں کے مؤرخ نشری کے بیان سے بھی صاف اشارہ ملتا ہے کہ عثمان کا مورث اعلیٰ سلیمان شاہ اور اس کے ساتھی جو اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور پچاس ہزار گھرانوں پر مشتمل تھے، غیر مسلم تھے، وہ کہتا ہے کہ ان میں سے کچھ شامی ترکمانوں کے آباء واجداد تھے اور بقیہ ان تمام خانہ بدوش قوموں کے جو روم میں ادھر ادھر پھرا کرتی تھیں اور خود نشری کے زمانہ میں بھی موجود تھیں، بارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے سیاحوں کی بکثرت شہادتوں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قومیں بت پرست تھیں، ان مختلف ترکی قبیلوں نے جو اسی زمانہ میں ایشیائے کوچک میں داخل ہوئے، جب عثمان کا قبیلہ وہاں آیا، ملک کے مغربی حصہ میں پہنچ کر اپنے آپ کو ایک اسلامی ماحول میں پایا، وہ تعداد میں تھوڑے تھے، ان کے لیے اس سے زیادہ قدرتی بات کوئی نہ تھی کہ اپنے سلجوقی اقرباء کا مذہب اختیار کرلیں، یہ اتنی قدرتی بات تھی کہ اس کے ذکر کی کوئی ضرورت سمجھی ہی نہیں گئی، عثمان اور اس کے قبیلہ کے اسلام لا چکنے سے عثمانی قوم پیدا ہوئی کیوں کہ اسلام ہی نے ان مختلف قوموں کو جو ایشیائے کوچک کے شمالی مغربی گوشہ میں آباد تھیں، متحد کر کے ایک قوم بنا دیا، یہ سلاجقہ قونیہ کے خاتمہ کا نہیں بلکہ اس تبدیل

---

1. The Foundation Of The Othman Empire By H. Adams Gibbns, New York, 1916.

مذہب ہی کا نتیجہ تھا کہ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) کے بعد عثمان کی فاتحانہ سرگرمیاں شروع ہوگئیں، حالاں کہ اس سے سغوت کی زندگی کے پچاس سال ان سرگرمیوں سے خالی تھی، ارطغرل اور عثمان ایک دیہاتی سردار کی حیثیت سے سغوت میں سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے تمام حوصلے اپنے چھوٹے سے گاؤں ہی تک محدود تھے، ان کی اس زمانہ کی کسی جنگ یا فتح کا ذکر تاریخ میں موجود نہیں، ارطغرل کے ساتھ چار سو سپاہی تھے اور عثمان کے ہم راہ اس سے زیادہ سپاہیوں کے ہونے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، اس کے تعلقات اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بالکل صلح و دوستی کے تھے، نشری کا بیان ہے کہ اس ملک کے کافر و مسلم دونوں ارطغرل اور اس کے لڑکے کی عزت کرتے تھے، کافر و مسلم کا کوئی سوال ہی نہ تھا، پھر دفعتہً ہم عثمان کو اپنے پڑوسیوں پر حملہ آور ہوتے اور ان کے قلعوں کو فتح کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) سے ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء) تک وہ اپنے مقبوضات کو وسیع کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی سرحد بازنطینی علاقوں سے مل جاتی ہے، اس کے سپاہیوں کی تعداد چار سو سے بڑھ کر چار ہزار تک پہنچ جاتی ہے، ہم ایک قوم کا ذکر سننے لگتے ہیں، جو ترک نہیں بلکہ اپنے سرداروں کے نام پر ''عثمانی'' کہلاتی ہے، اس سردار کا نام خود بھی اس کی قوم ہی کے نام کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، یہ لوگ یونانیوں (بازنطینیوں) اور تاتاریوں دونوں کے یکساں دشمن ہیں اور متعین طور پر اسلام سے وابستہ ہیں، ان میں ایک ایسا تبلیغی جوش ہے جو صرف ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جنہوں نے حال ہی میں مذہب تبدیل کیا ہو، ان کی باہمی وحدت اور ایشیائے کوچک کے دوسرے ترکوں سے ان کا قطعی طور سے مختلف ہونا، چودھویں صدی کے ابتدائی ساٹھ سالوں میں اس قدر نمایاں ہو جاتا ہے کہ یورپ انہیں بحیثیت ایک قوم کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، ایشیائے کوچک کی دوسری جماعتوں کی بہ نسبت چوں کہ یہی لوگ یورپ کے سامنے زیادہ آئے، اس لیے اہل یورپ نے انہیں محض ''ترک'' کہنا شروع کیا اور ان کو اناطولیہ کے تمام ترکوں کا نمائندہ سمجھنے لگے[1]۔

[1] اساس سلطنت عثمانیہ، از ہربرٹ گبنس، ص ۲۹-۲۵۔

اسی طرح کے ایک اور شبہ کا اظہار مولوی محمد عزیر صاحب نے ایک اور برطانوی مصنف ڈاکٹر جولیس گرمانی کی کتاب ''ترکوں کی اسلامی خدمات'' کا حوالہ دے کر بھی لکھا ہے جو کہ ۱۹۳۲ء میں لکھی گئی تھی:

پروفیسر گرمانس نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے، لکھتے ہیں: ''اپنے پیش رووں کی طرح جنہوں نے ایشیائے کوچک میں بود و باش اختیار کر لی تھی'' کے خان لی'' بھی ترک ہی تھے، البتہ ان کی بولی ذرا ان سے مختلف تھی، ایک اور فرق یہ تھا کہ سلاجقہ تو صدیوں سے اسلام لا چکے تھے لیکن یہ نوارد ہنوز اپنے قدیم خانہ بدوشی کے مسلک پر قائم تھے، ان کے سردار طغرل کے بیٹے عثمان کی شادی کے متعلق جو روایت مشہور ہے، اس سے ہمارا یہ قیاس حق بہ جانب ہے کہ انہوں نے ایشیائے کوچک کی اسلامی فضا میں داخل ہونے کے بعد اسلام قبول کیا[1]۔

مال خاتون وہ روایت یہ ہے کہ اس شہر کے قریب اِبترونی نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک خدارسیدہ عالم اوہ بالی رہا کرتے تھے، عثمان اپنی نوعمری کے زمانہ میں ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا، ان کی ایک نہایت حسین لڑکی تھی جس کا نام مال خاتون تھا، ایک روز اتفاق سے عثمان کی نظر اس دوشیزہ پر پڑ گئی اور وہ دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا، اس نے نکاح کا پیغام دیا لیکن اوہ بالی چوں کہ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، اس لیے فرق مراتب کا لحاظ کر کے انہوں نے اس پیغام کو قبول نہیں کیا، دو سال تک عشق و محبت کا یہ سلسلہ برابر قائم رہا اور عثمان نے اوہ بالی کے گھر کی آمد و رفت جاری رکھی، اس درمیان میں چند اور ترک سرداروں نے بھی، جو طاقت اور وجاہت میں عثمان سے بڑھے ہوئے تھے، مال خاتون سے شادی کی خواہش کی لیکن اوہ بالی نے ان کو بھی صاف جواب دیا، بالآخر ایک رات جب عثمان اوہ بالی کے یہاں مقیم تھا، اس نے یہ عجیب و غریب خواب دیکھا کہ ایک چاند ہلال بن کر اوہ بالی کے سینہ سے نکلا اور رفتہ رفتہ بدر کامل بن کر اس کے سینہ میں اتر آیا، پھر اس کے پہلو سے ایک زبردست درخت نمودار ہوا، جو بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحر و بر پر چھا گئیں، درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینوب بہ رہے تھے اور چار بڑے

---

[1] ترکوں کی اسلامی خدمات از ڈاکٹر جولیس گرمانس، ص ۱۰، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد ۱۹۳۲ء۔

مسٹر گینس اور ڈاکٹر جولیس گرمانی کے اعتراض کا جواب دینے سے پہلے ہم چاہیں گے کہ اس اشکال کی اصل حقیقت سے بھی قارئین واقف ہو جائیں۔ مسٹر گینس اور ڈاکٹر جولیس گرمانی کے اشکال کا جواب درج کرنے سے پہلے ڈاکٹر محمد عزیر صاحب خود اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ: "اب سے بائیس سال قبل تک یہ امر عموماً مورخین کے نزدیک مسلم تھا کہ ارطغرل اور اس کے ساتھی ایشیائے کوچک میں داخل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے۔ لیکن ۱۹۱۶ء میں مسٹر ہربرٹ گینس نے اپنی مستند تالیف "اساس سلطنت عثمانیہ" کو شائع کر کے یہ تازہ تحقیق پیش کی کہ سغوت میں بود و باش اختیار کرنے کے وقت عثمان اور اس کے قبیلے کے لوگ بت پرست تھے"۔

ڈاکٹر محمد عزیر صاحب نے تو صرف اپنی معلومات کو باقاعدہ تمام حوالوں سے مزین کرنے کے لئے مسٹر ہربرٹ اور ڈاکٹر جولیس گرمانی کے حوالے اپنی کتاب میں شامل کئے لیکن اس سے یہ مطلب اخذ کرلینا کہ اب یہ معلومات حتمی ہیں اور ان پر ایمان لے آنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ ایک سمجھدار اور بافہم شخص کسی طرح بھی ان معلومات کو قطعاً سچ تسلیم نہیں سکتا کیونکہ ضروری یہ ہے کہ ان معلومات کا حالات و واقعات کی ترتیب اور دیگر مورخین کی دی گئی معلومات سے موازنہ بھی کیا جائے اور اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ ہم یہاں چند دلائل سے اپنا موقف ثابت کرتے ہیں کہ ارطغرل غازی پیدائشی مسلمان تھے۔

۱۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مسٹر ہربرٹ کے اس بے بنیاد دعویٰ سے ۲۲ سال قبل تک پوری دنیا کے تمام مورخین اس بات پر متفق تھے کہ ارطغرل اور اس کے ساتھی ایشیائے کوچک میں داخل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے۔ تو پھر اچانک ۱۹۱۶ء میں مسٹر ہربرٹ کو ایسی کونسی دلیل مل گئی جس کی بنیاد پر انہوں نے ایسا بھونڈا دعویٰ کیا۔

قارئین کرام ذرا غور فرمائیے کہ یہ نئی تحقیق خاص طور پر اس وقت پیش کی گئی جب خلافت عثمانیہ اپنے آخری دور سے گزر رہی تھی اور اس کی ساکھ بچانے کے لئے اس وقت کے عثمانی خلیفہ سلطان عبد الحمید نے مسلمانوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے سغوت میں ارطغرل غازی کے مزار کی تعمیر نو کی اور ان کے ساتھی مجاہدین کا ایک علامتی قبرستان بھی آباد کیا جس کا مقصد ترکوں کو ان کے آباؤ اجداد کی طرف راغب کرنا تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ اسلام دشمن عناصر سلطنت عثمانیہ کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں اور عربوں کو ترکوں کی مخالفت پر اکسانے میں مصروف تھے، انگریز اور برطانوی مصنفین کا ترک مسلمان ہیروز کو کافر یا بت پرست ظاہر کرنے کی کوشش کرنا کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے۔

۲۔ ڈاکٹر محمد عزیر صاحب خود اپنی کتاب میں اس بات کا اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "حضرت عمر بن عبد العزیز جو کہ ۱۷ھ سے ۲۰ھ تک خلیفہ رہے ان کے دور سے ہی ماوراالنہر کے ترک بادشاہوں کو باقاعدہ اسلام کی دعوتیں دی جا چکی تھیں اور ان میں سے اکثر اسلام قبول بھی کر چکے تھے۔ اور دسویں صدی تک ماوراالنہر کی ترک قوم کے دس ہزار خیمے اسلام قبول کر چکے تھے جو ساغون اور کاشغر کے علاقوں میں آباد تھے۔ اسی دوران اسلام ترکوں میں اتنی تیزی سے پھیل رہا تھا کہ دو لاکھ سے زائد ترک خیمے مسلمان ہو چکے تھے"۔

خود آخری عباسی خلیفہ کی ماں بھی ترک النسل تھی اور اسی وجہ سے معتصم باللہ نے سامرا میں بہت سے ترکوں کو آباد کر کے اس کو اپنا پایہ تخت بنایا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ چنگیز خان کے پوتے برقائی خان اپنی فوج سمیت مسلمان ہو چکے تھے ایسے میں تیرہویں صدی تک تاتاریوں سے برسرپیکار رہنے والے ارطغرل اور ان کے قبیلے کا اسلام نہ لانے کا سوال اٹھانا بلاجواز اور غیر منطقی بات ہے۔

۳۔ مورخ اسلام جناب اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اور ڈاکٹر محمد عزیر دونوں ہی اپنی کتابوں میں یہ بات لکھتے ہیں کہ: "۶۲۱ھ میں جب مغلوں نے علاء الدین کیقباد کی ریاست پر حملہ کیا تو سلیمان خاں اور اس کے بیٹے ارطغرل نے اپنے ہم قوم ترکوں کو لے کر مغلوں کے خلاف علاء الدین کیقباد کی مدد کی، یہ مدد عین وقت پر پہنچی اور اس سے مغلوں کو شکست کھا کر فرار ہونا پڑا لہٰذا علاء الدین کیقباد سلجوقی نے سلیمان کو خلعت دے کر اپنی فوج کا سپہ سالار بنایا اور اس کے بیٹے ارطغرل کو شہر انگورہ کے قریب ایک وسیع جاگیر عطا کی"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سلطان علاء الدین کیقباد ایک طرف بت پرست تاتاریوں اور صلیبیوں کے ساتھ نبرد آزما بھی ہوں اور دوسری طرف ایک بت پرست (یعنی سلیمان خاں اور اسکے بیٹے ارطغرل) سے جنگی امداد بھی لیں اور پھر ان کو اپنی فوج کا سپہ سالار بھی بنالیں اور ساتھ ہی اس کو شہر انگورہ کے قریب ایک وسیع جاگیر بھی عطا کر دیں۔ یہ بات بھی عقل تسلیم نہیں کرتی۔

۴۔ ۱۳۰۱ء میں اچانک ارطغرل کے بیٹے عثمان کی قیادت میں عثمانی سپاہیوں کی بازنطینیوں کے ساتھ شدید جنگ اور شہنشاہ تک کی فوج کو شکست دینا ایک معجزے سے کم نہیں تھا جس کی منطق ڈاکٹر ہربرٹ گینس کے نزدیک عثمان کی فوج کا نو مسلم ہونا بتایا جانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کھسیانی بلی کا کھمبا نوچنا۔۔۔یعنی عثمانی فوج نے اپنے سے کئی گنا بڑی اور منظم فوج کو صرف اس لئے شکست دے دی کہ وہ سب کے سب تازہ تازہ جذبہ ایمانی سے منور ہوئے تھے۔ یہ بات بھی عقل سے آری ہے۔ الحمد اللہ مسلمان نیا ہو یا پرانا لیکن جب بھی بات دین کی اور اسلام کی بقاو سلامتی کی آتی ہے تو مسلمان واقعی ایسی تاریخیں رقم کر جاتا ہے کہ اس کے دشمنوں کی آہ وبکا صدیوں تک سنی جا سکتی ہے۔

۵۔ اس کے علاوہ ارطغرل کی ایک مسلمان سلجوقی شہزادی حلیمہ خاتون سے شادی اور ارطغرل کے والد سلیمان شاہ کا نام بذات خود ایک دلیل ہے۔ کیا کسی بت پرست نے آج تک اپنا نام سلیمان رکھا یا شہزادی حلیمہ تو دور کسی عام لڑکی کا نکاح ایک بت پرست سے ہونا ممکن ہے؟ اس کے علاوہ مسلمان مورخین میں سے ابن اثیر، علامہ شبلی نعمانی، حسرت موہانی اور نجیب اکبر آبادی کی کتب میں ارطغرل اور ان کے اجداد کے مسلمان ہونے کا تفصیل سے تذکرہ ملتا ہے۔

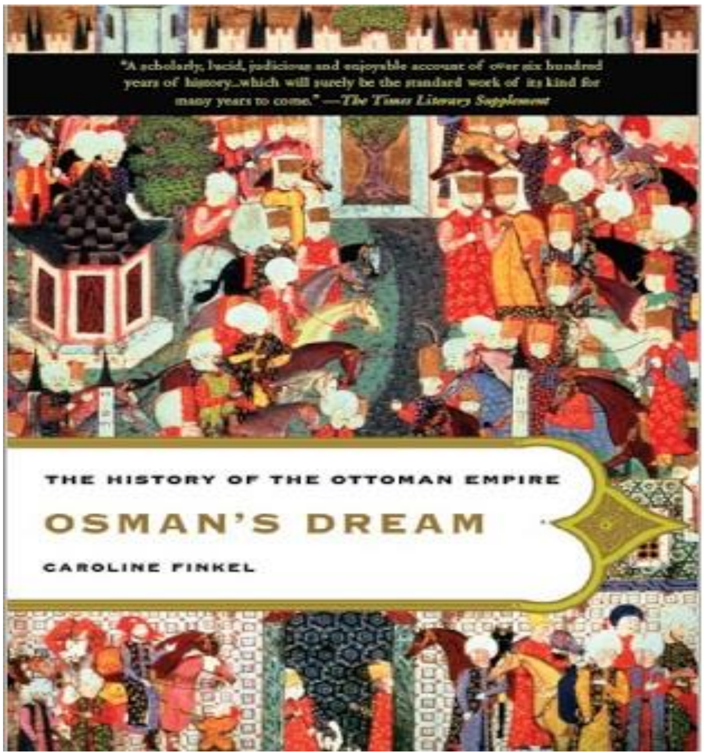
موجودہ دور کے مغربی مورخین کا ارطغرل کے بارے میں بیان

۱۔ برطانوی مؤرخ کیرولائن فنکل اپنی کتاب "عثمان کا خواب: سلطنت عثمانیہ کی تاریخ" میں لکھتی ہیں کہ: "عثمانی روایات کے مطابق ارطغرل نامی ایک قبائلی سردار شمال مغربی اناطولیہ میں آ کر سلجوق اور بازنطینی سلطنتوں کے بیچ کے علاقے میں آباد ہوا اور اس روایت کے مطابق سلجوق سلطان نے ارطغرل کو سغوت میں کچھ علاقہ عطا کیا تھا۔ لیکن ارطغرل کا عثمان سے کیا تعلق تھا"۔

فنکل آگے لکھتی ہیں کہ: ”عثمان کے دور سے ملنے والا واحد سکہ اگر اصلی ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ارطغرل یقیناً تاریخی شخصیت تھے۔ اس سکے پر درج ہے "جاری کردہ برائے عثمان ولد ارطغرل" درج ہے“۔

فنکل مزید لکھتی ہیں کہ: ”عثمان کا اپنے نام پر سکہ جاری کرنا ثابت کرتا ہے کہ وہ اس وقت صرف ایک قبائلی سردار نہیں تھے بلکہ اناطولیہ میں اپنے آپ کو سلجوق منگول سلطنت کے سائے سے باہر ایک خود مختار امیر سمجھنا شروع ہو چکے تھے۔ عثمانیوں کا پہلی بار ذکر سنہ ۱۳۰۰ء کے قریب ملتا ہے۔ اس وقت کے ایک بازنطینی مؤرخ نے لکھا کہ سنہ ۱۳۰۱ء میں بازنطینی فوج کا سامنا عثمان نامی ایک شخص کی فوج سے ہوا۔ "جنگ بافیوس" کہلانے والی یہ لڑائی قسطنطنیہ (استنبول) کے قریب لڑی گئی تھی اور اس میں بازنطینی فوج کو بری طرح شکست ہوئی۔ لیکن عثمانیوں کا بازنطینی سلطنت کی برابری کرنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ اور جب ایسا ہوا تو اس کے ساتھ ہی ایک خاندان کا اچانک گمنامی سے نکل کر اتنا آگے آنے کے بارے میں کئی کہانیوں نے بھی جنم لیا۔ مؤرخ کہتے ہیں کہ عثمانی اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ان کا علاقہ قسطنطنیہ کے قریب تھا جس سے کبھی بھی کامیابی کی صورت میں بڑا انعام یقینی تھا“۔

فنکل یہ بھی لکھتی ہیں کہ: ”ابتدائی عثمانی سلطانوں کو اپنے آغاز کی تاریخ معلوم کرنے سے زیادہ دلچسپی دوسروں پر حکومت کے اپنے حق کو ثابت کرنے میں تھی اور ان کے نزدیک ان کی سلطنت کا آغاز ایک خواب سے ہوا تھا جو عثمان نے ایک بزرگ درویش کے گھر میں قیام کے دوران دیکھا تھا۔ اس خواب کی کہانی کے حق میں دستاویزی ثبوت بھی تاریخ میں ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے ابتدائی دور کے زمینوں کے کاغذات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عثمان کے دور میں ادیبالی نامی بزرگ موجود تھے اور اس بات کی بھی کچھ شہادت ہے کہ ان کی بیٹی عثمان کی دو بیویوں میں سے ایک تھی“۔ (Osman's Dream: The History of the Ottoman Empire: Page # 2, 7,8, 12)



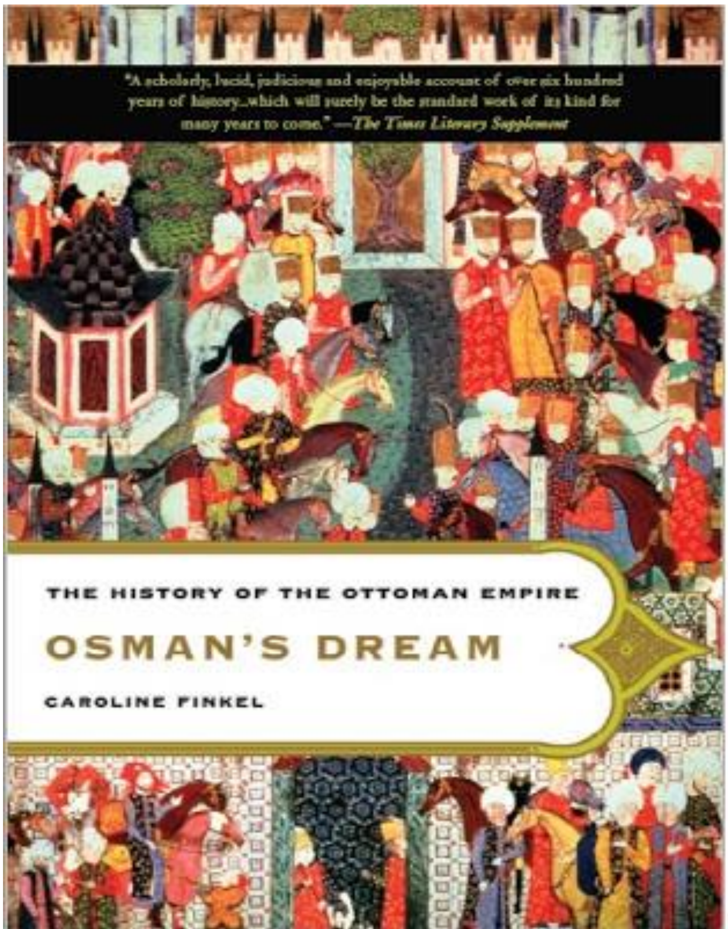
mind began to decipher the architects' account books and to examine the legal records; a new generation of scholars began to read between the lines of chronicles commissioned by victorious sultans, to see how the history of empire was not simply the history of its ruling family; and, perhaps most importantly, they began to look critically at the histories written – sometimes with all the sophistication of western scholarship – in territories that had once been under Ottoman rule, and discovered that they were partial and incomplete because, seeing through a glass darkly, their authors presented national myth as historical fact, and made assumptions about the nature of the Ottoman Empire without listening to the Ottoman voice.

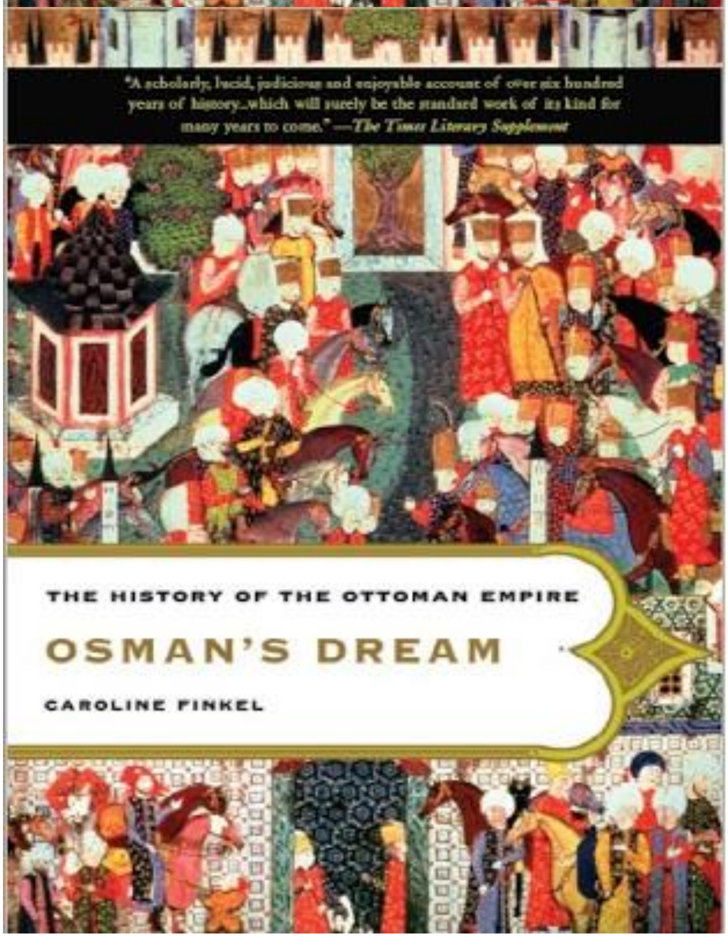
So by the time the Turkish Republic celebrated the seventy-fifth anniversary of its creation in 1998, it had the confidence to plan festivities on the eve of the second millennium to commemorate the founding 700 years earlier of the Ottoman Empire. But why should 1299 CE be considered the founding date of the empire? – there were no famous battles, no declarations of independence or storming of a bastille. The simplest explanations are often the most convincing: that year corresponds to the years 699–700 in the Islamic calendar.* By rare mathematical coincidence, the centuries turned at the same time in both the Christian and Islamic calendars. What more auspicious year to mark the founding of an empire that spanned Europe and the Middle East?

The early Ottomans, struggling to plant their authority, were less concerned with the date of the founding of their state than with the vision that underpinned their right to rule. To them, empire began quite literally with a dream. One night, the first sultan, Osman, was sleeping in the house of a holy man called Edebali when:

> He saw that a moon arose from the holy man's breast and came to sink in his own breast. A tree then sprouted from his navel and its shade compassed the world. Beneath this shade there were mountains, and streams flowed forth from the foot of each mountain. Some people drank from these running waters, others watered gardens, while yet others caused fountains to flow. When Osman awoke he told the story to the holy man, who said 'Osman, my son, congratulations, for God has given the imperial office to you and your descendants and my daughter Malhun shall be your wife'.[1]

First communicated in this form in the later fifteenth century, a century and a half after Osman's death in about 1323, this dream became one of the most resilient founding myths of the empire, conjuring up a sense of temporal and divine authority and justifying the visible success of Osman and his descendants at the expense of their competitors for territory and power in the Balkans, Anatolia, and beyond.





the coastal fringes, where soils are more productive and the climate less severe; the people of the coastal lands in turn looked to the sea for their livelihood. Thus were goods exchanged and alliances established.

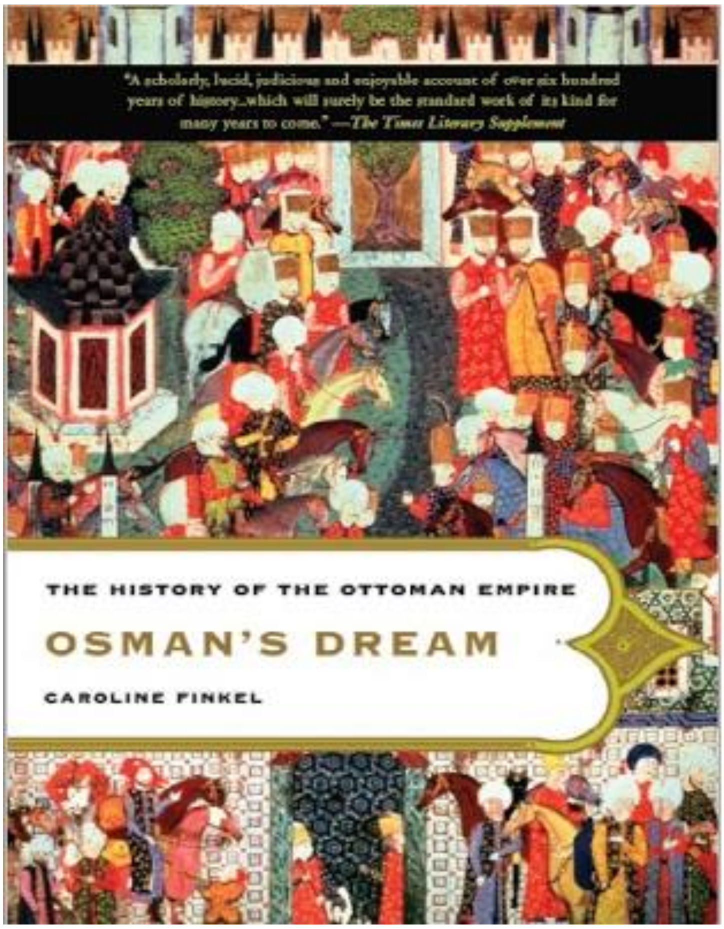
The Ottomans were not the first of the post-Mongol wave of Muslim Turcoman dynasties to appear in the historical record. We hear of the Germiyan house in 1239–40,[5] well before Osman's battle against the Byzantines in 1301, while the Karamanids, named after one Karaman Bey, first appear in 1256.[6] As they began to claim permanent lands, these emerging dynasties sought to make themselves visible in new ways, for instance by building monuments to impress would-be supporters. This, a practice of settled folk, not of nomadic pastoralists or subsistent agriculturists, can be seen as indicating the ambitions of former nomads to found a sedentary state. Evidence for the building activity of the Turcoman dynasties survives in dated inscriptions: from the mosque of the minor dynasty of Eşrefoğulları at Beyşehir in the lake district of south-west Anatolia of the year 696 of the Islamic calendar (1296–7 CE),[7] and from the now-demolished Kızıl Bey mosque in Ankara where the pulpit was repaired by the chiefs of Germiyan in 699 (1298–9).[8] The Great mosque built by the Karamanid leader Mahmud Bey in Ermenek dates, according to its inscription and foundation deed, from 702 (1302–3).[9] The earliest dated Ottoman structure of which we have record is the Hacı Özbek mosque in İznik where the foundation inscription is dated 734 (1333–4).[10]

Ottoman tradition recounts that a tribal chief called Ertuğrul settled in north-west Anatolia in the marcher-lands between the Seljuk–Ilkhanid and Byzantine Empires, and that the Seljuk sultan at Konya awarded him lands around the small settlement of Söğüt, north-west of modern Eskişehir (Dorylaeum), with the right to summer pastures for his flocks in the highlands south-west of Söğüt. If the only artefact which has come down to us from the time of Osman – an undated coin – is genuine, it suggests that Ertuğrul was an historical personage, for it bears the legend 'Minted by Osman son of Ertuğrul'.[11] And since the minting of coins was a prerogative accorded in Islamic practice – as in western – only to a sovereign, it indicates Osman's pretensions to be a princely ruler rather than a mere tribal chief, demonstrating that he had accumulated sufficient authority to challenge Ilkhanid claims to suzerainty over him and his people: the Turcoman emirates did not mint coins in the names of their own emirs while they remained under the nominal suzerainty of the Ilkhanids. The oldest surviving dated Ottoman coin is from 1326–7, however, after Osman's death, and some see this as the earliest the Ottoman state can be considered to have been independent of the Ilkhanids.[12]

The Ottomans were fortunate in their geography. Osman's lands were close to Constantinople, bringing him into contact with the governors of the Byzantine towns in north-west Anatolia, with whom he competed for influence as well as for pasture to satisfy the flocks of his followers. This proximity to Constantinople offered the promise of great rewards should that city fall, but also put the Ottomans under pressure from the Byzantine army as it sought to protect what remained of its beleaguered territory. Osman's earliest advances against Byzantium seem to have been concentrated against small settlements in the countryside rather than against the towns. It may be that the towns were difficult to capture while the countryside offered resources which were of greater value to him and his men. The representation of this area by a contemporary Byzantine historian as prosperous, populous and well-defended is borne out by archaeological evidence.[13] Even before his first datable victory over Byzantine forces in 1301, Osman seems to have assumed control of lands lying between his father's pastures around Söğüt and İznik although he failed, despite a lengthy siege between 1299 and 1301, to take İznik itself.[14]

After his victory over Byzantine forces in 1301, Osman was impossible to ignore. The Byzantine emperor Andronicus II Palaeologus thought to make a radical alliance against the growing threat he represented by offering one of the princesses of his family in marriage to Osman's nominal overlord, the Ilkhanid khan Ghazan (whose seat was at Tabriz in north-west Iran) and then, when Ghazan died, to his brother. But the anticipated reciprocal help in men and materials was not forthcoming and in 1303–4 Andronicus employed the Spanish adventurers of the crusading Catalan Grand Company to protect his domains from further Ottoman advance. Like so many mercenary groups, the Catalans turned to raiding on their own account,[15] calling upon Turcoman fighters – though not necessarily those under Osman's control – to join them in pursuit of their own objectives across the Dardanelles Straits in the Balkans. Only an alliance between Byzantium and the kingdom of Serbia[16] checked this Turcoman–Catalan advance.

The arrival of the Turcomans in Anatolia disturbed the equilibrium of the older states. The administrative hand of the once-great Byzantine and Seljuk–Ilkhanid



Turcoman Muslim marcher-lord of the Byzantine frontier in north-west Anatolia whose father may have been called Ertuğrul, there is little other biographical information about Osman. But his dream incidentally provides one more detail which is corroborated by documentary evidence: early Ottoman land deeds suggest that a holy man known as Sheikh Edebali lived at the same time as Osman, and there is some evidence that Osman married his daughter as one of his two wives.[36]

At the heart of Ertuğrul's lands at Söğüt is a small mosque bearing his name, and a tomb, said to have been built for him as an open structure by his son Osman and later enclosed by Osman's son Orhan.[37] However, since both mosque and tomb have been rebuilt so often that nothing of their original architectural form remains, no surviving buildings can with confidence be ascribed to Osman. Nevertheless, in the late nineteenth century, when Sultan Abdülhamid II sought to bolster his faltering regime by identifying it more closely with the great deeds of his illustrious forebears, he found it convenient to promote Söğüt as the Ottoman heartland and created there a veritable cemetery of the first Ottoman heroes. He rebuilt Ertuğrul's mausoleum and interred his purported remains in a marble sarcophagus, and added a grave for Ertuğrul's wife, one for Osman – even though he had been reburied in Bursa by his son Orhan – and graves for 25 of Osman's fellow warriors.[38] To the present day Söğüt remains a shrine and the site of an annual festival to commemorate the earliest days of the Ottomans.

Osman probably died in 1323–4, having secured for his heirs substantial territory in north-west Anatolia, stretching from his headquarters at Yenisehir, the 'New City' (Melangeia), to Eskişehir, the 'Old City', with Söğüt at its centre. Yenişehir was strategically situated between İznik and Bursa, two places he had intended but failed to capture.[39] In 1326 his son Orhan captured Bursa and this important city became the new hub of Ottoman power. Like İznik and İzmit (Nicomedia), Bursa had for some time been isolated from Constantinople as a result of Osman's control of the surrounding countryside; Orhan continued his father's blockade of the city and starved the inhabitants into submission. The Moroccan traveller ibn Battuta reported that Orhan was the foremost and richest of the several Turcoman chiefs whose courts he visited during his sojourn in Anatolia in 1330–32. He further noted that Orhan never stayed in one place for long but moved constantly between the hundred or so fortresses he commanded, in order to make sure they were in good repair. When he visited newly-Ottoman

۲۔ امریکی مؤرخ اسٹینفورڈ جے شا اپنی کتاب ”سلطنت عثمانیہ کی تاریخ اور جدید ترکی“ میں اسی روایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”سلطنت عثمانیہ کی شروعات تاریخ کے طالب علموں کے لیے ہمیشہ سے اہم سوال رہا ہے لیکن اس دور کے ذرائع کی کمی اور بعد کے ادوار میں لکھی گئی روایات میں تضاد کی وجہ سے پورے یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ عثمانیوں کا جد امجد سلمان شاہ تھے جو قائی قبیلے کے سردار تھے اور ۱۲ ویں صدی کے آخر میں شمالی ایران کے ایک علاقے میں آباد رہے۔ عثمانی روایات کے مطابق ارطغرل سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان اوّل کے والد تھے۔ روایت کے مطابق منگول حملوں کے پیش نظر دیگر بہت سے ترک قبائل کی طرح یہ قبیلہ بھی غلامی اور تباہی سے بچنے کے لیے نئے علاقوں کی طرف روانہ ہوا“۔

جے شا کے مطابق: ”سلیمان شاہ شام میں داخل ہوتے ہوئے دریائے فرات میں ڈوب گئے اور اس کے بعد ان کے دو بیٹے واپس چلے گئے جبکہ ارطغرل نے مغرب کی طرف اپنا سفر جاری رکھا اور اناطولیہ کے علاقے میں داخل ہو گئے جہاں سلجوق حکمرانوں نے ان کی مدد کے بدلے انھیں اناطولیہ کے مغربی علاقے میں زمین دے دی“۔

جے شا اس روایت کے مطابق مزید لکھتے ہیں: ”ارطغرل ۱۲۸۰ء میں انتقال کر گئے اور قبیلے کی قیادت ان کے بیٹے عثمان کو مل گئی“۔ (History of the Ottoman Empire and Modern Turkey: Page # 13)

HISTORY OF THE OTTOMAN EMPIRE AND MODERN TURKEY

Volume I: Empire of the Gazis: The Rise and Decline of the Ottoman Empire, 1280–1808

STANFORD SHAW

Professor of History
University of California, Los Angeles

CAMBRIDGE UNIVERSITY PRESS

mander in the marches, Kılıç Arslan, brother of the Seljuk sultan Mesut, to revolt against his brother. Yavlak Arslan and his son Ali cooperated with the combined Mongol and Seljuk armies, defeated Kılıç Arslan, and used the prestige gained from these victories to become independent. Ali penetrated Byzantine territories to the west as far as the Sakarya river. He then maintained his power by cooperating with the Byzantines, more or less becoming their mercenary march commander against the other Turkoman gazis and the Mongols. The role abandoned by Ali as leader of the gazis in the western marches was taken up by Osman Bey, founder of the Ottoman dynasty. Who was he? How and why did his dynasty emerge at this time?

The problem of Ottoman origins has preoccupied students of history, but because of both the absence of contemporary source materials and conflicting accounts written subsequent to the events there seems to be no basis for a definitive statement. The traditional account relates that the ancestor of the dynasty was one Süleyman Şah, leader of the Kayı tribe of Turkomans, who ruled the small area of Māhān in northeastern Iran in the late twelfth century. He is said to have fled from the Mongol invasion in the early thirteenth century along with thousands of other Turkomans trying to avoid death or enslavement at the hands of the new conquerors coming from Central Asia. It is believed that he drowned while crossing the Euphrates into Syria, after which his family divided; two sons led most of the family back to Horasan to enter Mongol service while one son, Ertuğrul, led part of it westward into Anatolia.

Ertuğrul is considered to have been the founder of the Ottoman dynasty in Anatolia. Supposedly, he brought some 400 followers into the service of the Seljuks of Rum as auxiliaries against both the Byzantines and the Mongols as the latter began pressing through Iraq into eastern Anatolia. In return for this service, according to legend, the Seljuk sultan gave Ertuğrul lands in the marches of western Anatolia, two small districts, Söğüt and Domaniç, in northern Phrygia on the borders of the Byzantine province of Bithynia. When Ertuğrul died (c. 1280), this dominion and his leadership of his portion of the Kayı tribe passed to his son Osman.

There are many variations to this story, the most important of which, deriving from recently discovered thirteenth-century accounts, indicate that the ancestors of the Ottomans entered Anatolia not in the thirteenth century in flight from the Mongols but in the eleventh century among the Turkomans who spread into the subcontinent following the Battle of Manzikert. According to this information, the Ottomans' ancestors for two centuries were no more than rootless nomads who sold their services to the highest bidders, leaving their claimed connection with the Seljuks very questionable. Further, it was considerably afterward, after the Ottomans had built an empire, that they spread the idea that their ancestors had entered Anatolia as military commanders in Seljuk service rather than as common nomads, to enhance their own claims to rule. Whatever the truth of these stories, the fact remains that Osman, founder of the Ottoman dynasty, was born at Söğüt, in northeastern Anatolia, around 1258 and inherited his patrimony on the borders of Bithynia some time before 1280 just as the emir of the marches was abandoning his struggle with the Byzantines.

Osman I, 1280–1324

Osman's contributions seem to have been limited to establishing the dynasty and beginning the policy of developing it primarily at Byzantine expense while avoiding conflict with the more powerful Turkoman neighbors until the state was strong

HISTORY OF THE OTTOMAN EMPIRE AND MODERN TURKEY

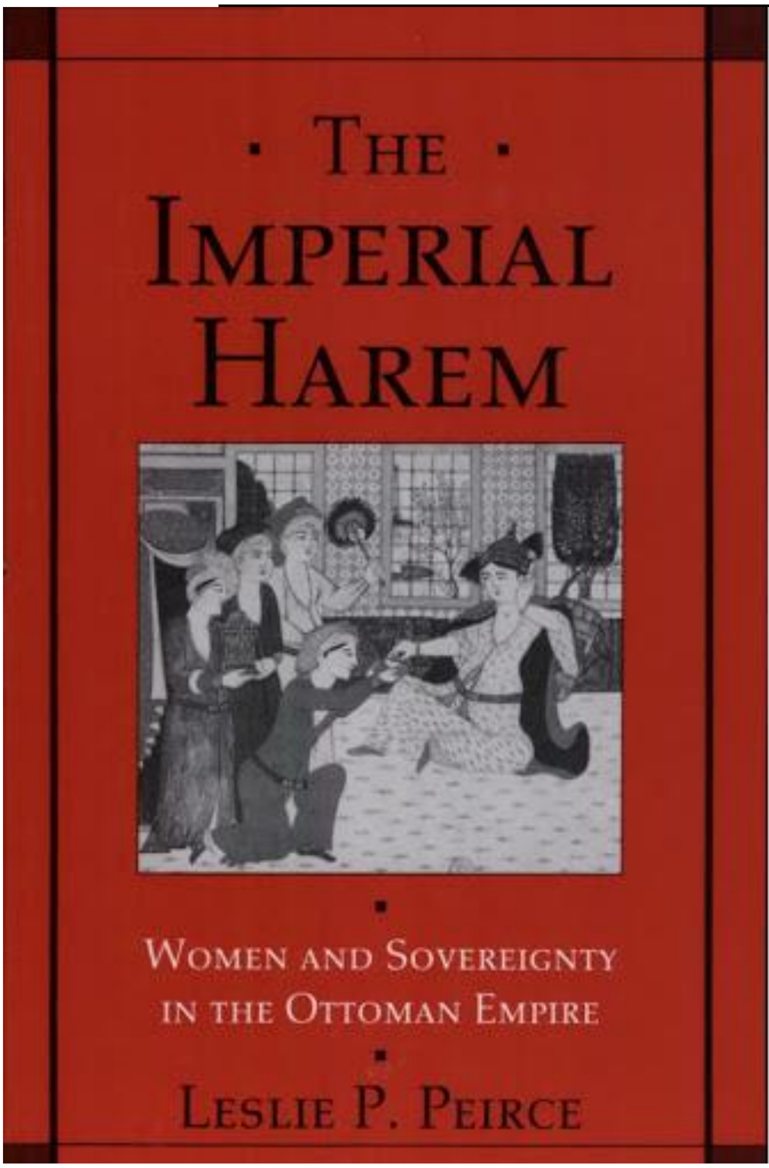
Volume I: Empire of the Gazis: The Rise and Decline of the Ottoman Empire, 1280–1808

STANFORD SHAW

Professor of History
University of California, Los Angeles

CAMBRIDGE UNIVERSITY PRESS

امریکی پروفیسر لیسلی پی پیرس اپنی کتاب ”دی امپیریل حرم: ویمن اینڈ سوورینٹی اِن دی اوٹومن ایمپائر“ میں لکھی ہیں: ”سلطنت عثمانیہ کے آغاز کے بارے میں سب سے زیادہ سنی جانے والی روایت کے مطابق عثمان نے اپنی ابتدائی کامیابیوں کے بعد ایک خواب دیکھا تھا۔ اس خواب میں انھوں نے دیکھا کہ ایک درویش شیخ ادیبالی کے سینے سے چاند نمودار ہوتا ہے اور اس کے اپنے سینے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پیٹ سے ایک بہت بڑا درخت نکلتا ہے جس کا سایہ پوری دنیا پر چھا جاتا ہے۔ اس درخت کی شاخوں کے نیچے چشمے بہتے ہیں جن سے لوگ پانی پیتے ہیں اور کھیت سیر اب ہوتے ہیں۔ عثمان نے جب شیخ ادیبالی سے تعبیر پوچھی تو انھوں نے کہا کہ خدا نے عثمان اور اس کی اولاد کو دنیا کی حکمرانی کے لیے چن لیا ہے اور انھوں نے کہا کہ ان کے سینے سے نکل کر عثمان کے سینے میں داخل ہونے والا چاند ان کی بیٹی ہے جو اس خواب کے بعد عثمان کی اہلیہ بن گئیں“۔ (The Imperial Harem: Women and Sovereignty in the Ottoman Empire: Page # 16)



16 THE POLITICS OF REPRODUCTION

Turco-Mongol traditions of pre-Islamic Central Asia, sovereignty was held to be granted by the divine power to a family chosen for earthly rule.[5] This notion was reinforced by the classical Islamic tradition that God gives to whomever he chooses a turn at sovereignty (*dawla, devlet* in Turkish, a word originally meaning "turn" or "revolution" which acquired the additional meanings of "dynasty" and then "state"). The most widely repeated historical legend regarding the inception of the Ottoman house as a ruling dynasty and its assumption of sovereignty reflected both these traditions.

According to this legend, after Osman's first local victories over neighboring Byzantine lords, he had a dream the meaning of which was obscure to him. In this dream, a moon rose from the breast of a widely revered dervish sheikh, Edebali, and entered Osman's own breast. From Osman's navel sprang a great tree, which grew to shade the entire world. Under the branches of the tree were mountains, from which flowing water served to quench the thirst of some and to irrigate the fields of others. When Osman sought Edebali to learn the meaning of the dream, the sheikh told him that it signified God's grant of sovereignty to him and his descendents. The moon, explained Edebali, represented his own daughter, to whom Osman was forthwith united in marriage (the name of this woman varies in the sources).[6] In most versions, the historical narrative continues by noting two direct outcomes of the event: Osman's solemn dedication to *ghaza*, holy war against the infidel, and the birth of Orhan, the second ruler, from the union of Osman and Edebali's daughter.

While the numerous histories of the dynasty that flourished in the late fifteenth and sixteenth centuries contain other legends justifying Ottoman rule, all of them recount this particular story of the dynasty's emergence into history.[7] The story of the dream appearance of a tree signifying hegemonic sovereignty was not unique to the Ottomans; this account of Osman's dream seems to be a variation on an old pre-Islamic Turkish theme.[8] However, a significant feature of the Ottoman version is the idea of the dynasty's foundation in a semisacred marital union: the holy man's charisma, transmitted through his daughter, figures as a necessary element in the dynasty's future success. It was not unusual in Turkish tradition to consider the mother as well as the father a source of legitimacy. In the earliest written record from a Turkish state, the sixth/seventh-century Central Asian empire of the Gök-turks, the ruler presents himself as the political heir of both parents: "In order that the name and fame of the Turkish people would not perish, the heavenly god [Tanrı], who had raised my father, the khakan, and my mother, the khatun, and who had granted them the state, . . . [that heavenly god] enthroned [me]."[9]

If we were to concentrate on formal, constitutional aspects of sovereignty in the Ottoman state, which is what virtually all treatments of Ottoman political history have done, it might seem that these legends bore little relation to the reality of women's political power. In neither Islamic states nor pre-Islamic Central Asian states were rights to supreme political authority, formally exercised by men, formally inherited through women.[10] In the Ottomans' most

معتبر تاریخی حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ارطغرل کا قبیلہ عقیدتاً اہل سنت والجماعت سے منسلک اور مسلکاً حنفی تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں ارطغرل کی زندگی کے احوال اور ان کی سرگرمیوں سے متعلق زیادہ معلومات نہیں ملتیں، البتہ سات صفحات پر ایک قدیم دستاویز آج بھی ترکی میں موجود ہے جس میں ارطغرل غازی کی منگولوں اور صلیبیوں کے خلاف جدوجہد کا تذکرہ موجود ہے۔

اس کے علاوہ ان کے بیٹے عثمان اوّل کے ڈھالے ہوئے سکوں سے تاریخی طور پر ان کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان سکوں میں عثمان اوّل نے اپنے والد کا نام ارطغرل ضرب کروایا تھا۔

کئی مورخین نے لکھا ہے کہ ارطغرل غازی اسلام کی سربلندی کی خاطر جدوجہد کر رہے تھے اور اس وقت کے موجود ترک قبائل سے ان کی سوچ بالکل الگ تھی۔ ایک عظیم مشن اور مقصد کے تحت وہ ترک قبائل کو متحد کر رہے تھے اور صلیبیوں اور منگولوں کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ ایک عظیم اسلامی سلطنت کا قیام عمل میں آئے۔ وفات کے دس سال بعد ان کے سب سے بڑے بیٹے عثمان اوّل نے ان کا یہ خواب پورا کیا اور ایک عظیم الشان سلطنت عثمانیہ کی بنیاد رکھی۔ ترکی کے شہر سغوت میں ارطغرل کے نام کی ایک مسجد اور ایک مزار ہے۔ ارطغرل کے بیٹے عثمان نے اس کی تعمیر کی تھی اور پھر عثمان کے بیٹے اورخان غازی نے اس میں اضافہ کیا۔ اسی مقبرہ کے احاطے میں ارطغرل کی زوجہ حلیمہ سلطان، ان کے جانشین ترغوت اور بقیہ ساتھیوں کی قبریں موجود ہیں۔

مندرجہ بالا تمام بحث سے حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ارطغرل غازی اور ان کے اجداد نہ صرف مسلمان بلکہ عظیم ترین مجاہدین بھی تھے۔ جنہوں نے کمزور پڑتی ملت اسلامیہ کا بھرپور دفاع کر کے نا صرف تاتاریوں، صلیبیوں اور بازنطینیوں کو شکست دی بلکہ اپنی مسلسل اور ان تھک جدوجہد سے ایک نئی اسلامی خلافت کی بنیاد بھی رکھی جس نے بلا مقابلہ تقریباً ۶۰۰ سال تک مسلمانوں پر متفقہ حکومت بھی کی۔

ایسے میں ارطغرل غازی کے مسلمان ہونے پر سوال ایک ایسا ہی شوشہ ہے جس کی مثالیں اس سے پہلے بھی کئی جگہ مل چکی ہیں۔ بدقسمتی سے ابھی تک ہمیں اندازہ ہی نہیں ہو پایا کہ آج کے اس کانٹینٹ وار کے دور میں ہم پر مسلط قوموں کی پالیسی ہی یہی رہی ہے کہ ہم سے ہمارے ہیروز اور رہنما چھین لئے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ محمد بن قاسم ہوں یا محمود غزنوی، ٹیپو سلطان ہوں یا صلاح الدین ایوبی حتیٰ کہ قائداعظم محمد علی جناح تک سب کے کرداروں کو مشکوک بنانے کے لئے ہر ماہ دو ماہ بعد کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑ دیا جاتا ہے اور ہمارے نام نہاد لبرل دانشور اس کو سچ مان کر انگریز مصنفین کی بات کو حرف آخر مان لیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان حقائق کا تحقیقی جائزہ لیں تو ہمیں کھرے اور کھوٹے کی پہچان کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو۔

میں اپنی اس تحریر کا اختتام شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ایک فقرہ پر کرونگا جس سے حق اور باطل کی پہچان کرنے میں ہمیں بہت مدد ملے گی۔ انشاءاللہ

"حق کی پہچان کرنی ہو تو باطل کے تیروں کا رخ دیکھو جہاں لگیں وہ حق ہے"